صحیح فلسفہ تاریخ کیا ہے؟

قرآن کی راہ نمائی

ڈاکٹر محمد رفیع الدین

عمل تاریخ کی سمت اور غرض و غایت کے متعلق اقبال کے خیالات نہایت واضح ہیں۔ اسے یقین ہے کہ تاریخ کے عمل کا مقصد نوع انسانی کی تکمیل ہے اور یہ مقصد ایسا ہے جو ضرور پورا ہو کر رہے گا۔ ایک آخری عالم گیر انقلاب کے بعد عالم انسانیت کی تعمیر ایک ایسے نظریہ کی بنیادوں پر عمل میں آئے گی جو بالقوۃ انسان کی فطرت کے اندر موجود ہے۔ اقبال کہتا ہے کہ :

اس وقت انسان کے نظریات ناپختہ ہیں لیکن جس طرح سے سیلاب موتیوں کی پرورش کرکے انہیں درجہ تکمیل تک پہنچاتا ہے یہاں تک کہ وہ پانی سے باہر نکال لئے جاتے ہیں اسی طرح سے انسان کے نظریات بھی حادثات زمانہ کے طوفان میں پرورش پاکر تکمیل کو پہنچیں گے یہاں تک کہ گرداب سپہر نیلگوں سے بھی بالاتر ہوجائیں گے۔ یہ مشت خاک ایک دن فرشتوں سے بھی زیادہ نورانی ہونے والی ہے۔ پھر زمین اس کی قسمت کے ستارے کی بلندی کی وجہ سے آسمان سے مقابلہ کرے گی۔ اس وقت انسان کی حالت ایک ایسے شعر کی طرح ہے جو وزن سے عاری ہے لیکن آخرکار یہ شعر موزوں ہوکر رہے گا۔ اس کی ضمانت خود انسان کی فطرت ہے جو اپنے سارے حسن و کمال اور معقولیت اور موزونیت کے سمیت اپنا اظہار پاکر رہے گی۔ ہمیں اپنی طرف سے اسکی کوئی ضمانت مہیا کرنے یا کوئی ثبوت پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس موضوع پر اسکے اشعار ملاحظہ ہوں

فروغ مشت خاک از نوریان افزوں شود روزے
زمین از کوکب تقدیر او گردوں شود روزے
خیال او کہ از سیل حوادث بروزش گیرد
ز گرداب سپہر نیلگوں بیروں شود روزے
یکے در معنئی آدم نگر از ما چہ می پرسی
ہنوز اندر طبیعت سے خلد موزوں شود روزے

آدم خاکی کا عروج ایک شاندار مستقبل کا پتہ دے رہا ہے ستارے بھی جب اس کا خیال کرتے ہیں تو سہم جاتے ہیں۔ انسان جو جنت سے نکالا گیا تھا اور

آسمان کا گویا ایک ٹوٹا ہوا ستارہ تھا ایک روز اسی ماہ کامل کی طرح روشن اور بلند ہونے والا ہے جس کے سامنے ستارے ماند پڑ جاتے ہیں—

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

اقبال شاکی ہے کہ مدت ہوئی مسجدوں، مکتبوں اور مے خانوں کو بسانے والے سب ہی مستقبل کے اس عالم گیر انقلاب کی اہمیت سے بے خبر ہیں جو عالم انسانیت کو ترقی اور تکمیل کے ایک نئے دور میں داخل کرے گا اور جس کے بعد کوئی دوسرا انقلاب نہ آسکے گا یہ وقت تھا کہ وہ اس انقلاب کی اہمیت کو جانتے اور اسے بروئے کار لانے کے لئے میدان میں آتے۔

کس کو معلوم ہے ہنگامۂ فردا کا مقام
مسجد و مکتب و مے خانے ہیں مدت سے خموش

تاریخ کی حرکت مستقبل میں جس انسان کو وجود میں لا رہی ہے اقبال اسکے فراق کے درد سے بیتاب ہے اور اس کے جلد آنے کی آرزو کرتا ہے ''اے لیل و نہار کے سیاہ و سفید گھوڑے پر سوار ہو کر آنے والے انسان کامل جلد آ۔ اے وجود کی آنکھوں کے نور جلد آ۔ کائنات کی رونق بن اور ہماری آنکھوں میں آباد ہو۔ قوموں کی باہمی لڑائیوں کے شور کو خاموش کر اور اپنے پیغام امن کے سریلے راگ کو ہمارے کانوں کی جنت بنا''۔

اے سوار اشہب دوراں بیا
اے فروغ دیدۂ امکاں بیا
رونق ہنگامۂ ایجاد شو
در سواد دیدہ‌ہا آباد شو
شورش اقوام را خاموش کن
نغمۂ خود را بہشت گوش کن

ظاہر ہے کہ اقبال کا مطلب یہ ہے کہ مستقبل کا انسان کامل وہ انسان ہوگا جو خدا کی صفت کو درجۂ کمال پر پہنچائیگا اور عملی زندگی میں خدا کی صفات حسن و کمال کو آشکار کرے گا۔ جس سے انسانی معاشرہ تمام نقائص سے پاک ہوجائے گا یہی انسان کا ماہ کامل بننا ہے جس کے خیال سے ستارے بھی سہمے جاتے ہیں۔ یہی اسکی فطرت ہے جسے وہ بالآخر پا کر رہے گا۔

اقبال کے اس نظریۂ تاریخ سے تقدیر امم پر روشنی پڑتی ہے اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کون سی قوم ہوگی جو نظریات کی جنگ میں سلامت رہے گی اور کون سی قومیں ہوں گی جو اس جنگ میں مٹ کر فنا ہوجائیں گی۔ لیکن اگر کوئی اقبال سے پوچھے کہ اس نے عمل تاریخ کی منزل مقصود کا یہ نظریہ کہاں سے لیا ہے تو وہ کہتا ہے کہ یہ نظریہ قرآن میں موجود ہے بشرطیکہ کوئی شخص قرآن کو خود قرآن کی روشنی میں سمجھے اور امام رازی کی طرح دور از کار منطقی موشگافیوں میں پڑ کر قرآن کے اصل مطلب کو اپنی نظروں سے اوجھل نہ کردے۔

چوں سرمۂ رازی را از دیدہ فرو شستم
تقدیر امم دیدم پنہان بکتاب اندر

گویا اقبال کے نزدیک قرآن میں ان اصولوں کا پتہ چلتا ہے جن کی رو سے قوموں کی تقدیر کا فیصلہ ہوتا ہے اور جن کی بناء پر قوموں کی زندگی اور موت کی داستانیں مرتب ہوتی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اقبال کے نزدیک قرآن کے اندر ایک ایسے فلسفہ تاریخ کے عناصر موجود ہیں جو قوموں کے عروج و زوال کے اسباب پر روشنی ڈالتا ہے اور اقبال کا یہ خیال درست ہے۔ قرآن کا اپنا ایک فلسفۂ تاریخ ہے اور اس کا امتیاز یہ ہے کہ وہ درست ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن حکیم انسانی اعمال و افعال کی قوت محرکہ کا ایک ایسا نظریہ پیش کرتا ہے جو صحت اور معقولیت کے تمام معیاروں پر پورا اترتا ہے اور علمی دنیا پر قرآن حکیم کا یہ احسان عظیم ہے۔ تاریخ کے فلسفی کا رول یہ ہے کہ وہ تاریخ کے حالات اور واقعات کا مطالعہ کرکے عمرانی تغیرات کے اصولوں کو دریافت کرے اس کی کاوشوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ معلوم کرے کہ قوموں اور تہذیبوں کا عروج و زوال کون سے قوانین کا پابند ہے اور ان کی بقا اور فنا میں کون سے عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ کیا کوئی تہذیب ایسی بھی ہوسکتی ہے جسے ہم حرکت تاریخ کی منزل مقصود قرار دے سکیں جس پر زوال اور فنا کے عوامل اثر انداز نہ ہوں اور جس کے لئے عروج اور بقا کے عوامل پوری شدت اور قوت سے اپنا کام کریں۔ اگر کوئی تہذیب ایسی بھی ہوسکتی ہے تو اس کے لوازمات کیا ہیں؟ اور فلسفۂ تاریخ کا عملی فائدہ یہ ہے کہ اس کی روشنی میں قومیں زوال اور فنا کی راہوں سے بچ کر عروج و بقا کے راستوں پر گامزن ہوسکتی ہیں۔ لیکن فلسفۂ تاریخ کا عملی فائدہ اسی صورت میں ایک حقیقت

بن سکتا ہے جب فلسفۂ تاریخ صحیح ہو اور اس کے مطالعہ سے درحقیقت قوموں کے عروج و زوال اور بنا اور فنا کے صحیح قوانین کا پتہ چلتا ہو اور قایم رہنے والی تہذیب کے لوازمات کا علم حاصل ہوتا ہو۔

ظاہر ہے کہ تاریخ افراد کے اعمال و افعال سے صورت پذیر ہوتی ہے اور انسان فرد کے اعمال اور افعال کا اصل منبع اس کی فطرت ہے جو اس کے اندر ہے اس کا مطلب صاف طور پر یہ ہے کہ حرکت تاریخ کے اسباب اور قوموں کے عروج و زوال اور بنا اور فنا کے قوانین انسان کے اندر کارفرما ہیں اس سے باہر نہیں۔ انسان کی فطرت سے مراد اس کی فطری خواہشات ہیں یعنی وہ بنیادی خواہشات جو پیدائش کے وقت وہ اپنے ساتھ لیکر آتا ہے۔ چونکہ انسان کی شخصیت ایک منتظم وحدت بن جاتی ہے اور اس کا ایک خاص مقصد ہوتا ہے جس کے حصول کے لئے وہ اپنی تمام خواہشات کو ایک نظم اور ضبط میں رکھکر جدوجہد کرتی ہے۔ دور حاضر کے حکماء نے بجا طور پر اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ انسان کی فطری خواہشات میں سے کوئی ایک خواہش ایسی ہے جو باقی تمام خواہشات پر حکمران ہے۔ اور ان کو اپنے ماتحت منظم کرتی ہے اور اپنی ضروریات کے مطابق ان کی تکمیل اور تشفی کی اجازت دیتی ہے۔

انسان کی شخصیت ایک ایسی گاڑی کی طرح ہے جس میں کئی گھوڑے جتے ہوئے ہوں ظاہر ہے کہ اگر یہ گاڑی نہایت سرعت کے ساتھ ایک خاص سمت میں ایک خاص منزل کی طرف جا رہی ہو تو ہم اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہوں گے کہ گاڑی کے اندر کوئی کوچوان ایسا ہے جو تمام گھوڑوں کو کنٹرول کر رہا ہے اور ان کو اپنی منزل مقصود کی طرف چلا رہا ہے لیکن اگر گاڑی رک رک کر چل رہی ہو اور کبھی دائیں اور کبھی بائیں اور کبھی سامنے جا رہی ہو تو اس سے ظاہر ہو جائے گا کہ گاڑی کے اندر کوئی کوچوان نہیں جو گھوڑوں کو اپنی اپنی من مانی سمتوں سے روک کر ایک خاص سمت میں چلائے۔ چونکہ انسانی شخصیت کی گاڑی انسان کی مختلف اور متضاد خواہشات کے باوجود اپنی پسندیدہ منزل کی طرف آسانی سے چلی جاتی ہے۔ یہ نتیجہ بالکل درست ہے کہ انسان کی کوئی خواہش ایسی ہے جو اس گاڑی کے کوچوان کی حیثیت رکھتی ہے اور انسان کی تمام خواہشات کو ضبط میں رکھتی ہے۔ انسان کی یہی خواہش اس کے تمام اعمال و افعال کی قوت محرکہ ہے۔ اس کی یہی خواہش ہے جو اسکی پوری فطرت ہے، جو اصل انسان ہے، انسان کی یہی خواہش ہے جو تاریخ بناتی ہے اور جسکا فلسفہ تاریخ

کا فلسفہ کہلاتا ہے ۔ فلسفہ تاریخ کوئی الگ تھلگ فلسفہ نہیں ہو سکتا بلکہ ہمیں انسان کے اعمال کی قوت محرکہ کے فلسفہ کو ہی فلسفۂ تاریخ کہنا پڑتا ہے لہذا تاریخ کے فلسفی کیلئے یہ جاننا نہایت ضروری ہے کہ انسان کی کون سی خواہش ہے جو اس کے اعمال کی قوت محرکہ ہے ۔ اگر وہ اس خواہش کو جان اور پہچان لے تو پھر انسانی اعمال اور افعال اور تاریخ کے سارے واقعات اور حالات کو ٹھیک طرح سے سمجھنے کیلئے ایک کلید اس کے ہاتھ آ جاتی ہے اور وہ بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ تاریخ کے واقعات میں جس حد تک کہ وہ انسانی اعمال سے متشکل ہوتے ہیں کونسا اصول کارفرما ہے ۔ اب تک اس کی کارفرمائی کس طریق سے ہوتی رہی ہے اور آخرکار کیا نتائج پیدا کرے گی۔ چونکہ اسے معلوم ہوگا کہ تاریخ کے سارے عمل کا باعث انسان کی اس حکمران خواہش کی مکمل اور مستقل تشفی اور تسکین ہے ۔ وہ عمل تاریخ کی غرض و غایت کو سمجھ سکے گا اور نوع انسانی کے مستقبل کے متعلق واضح نظریات بہم پہنچا سکیگا اور کسی قوم کے زوال کو عروج میں بدلنے کیلئے واضح تجاویز پیش کرسکے گا ۔ اس کے تمام نتائج صحیح ہوں گے اور اس کا استدلال اندرونی تضادات سے پاک ہوگا ۔

اس کے برعکس اگر تاریخ کا کوئی فلسفی یہ نہ جانتا ہو کہ انسان کے اعمال کی قوت محرکہ کونسی ہے تو چونکہ وہ انسانی نفسیات کے قوانین سے ناپلد ہوگا وہ تاریخ کے واقعات کو جو قوانین نفسیات کے قدرتی مظاہر ہیں ٹھیک طرح سے نہیں سمجھ سکے گا اور ان کو معنی خیز بنانے کے لئے اور ان کی تشریح کرنے کے لئے وہ بے بنیاد اور وہمی قوانین و اصول وضع کریگا۔ ایک وقت وہ تھا جب انسان مادی قوانین سے ناپلد تھا اور مادی دنیا کے قدرتی مظاہر مثلاً سورج یا چاند کا گرہن، چاند کا بڑھنا گھٹنا، بھونچال، آندھیاں، بجلی اور کڑک، موسموں کا تغیر وغیرہا کی تشریح کے لئے دیوتاؤں کے دخل و عمل ایسے وہمی اسباب تلاش کیا کرتا تھا لیکن مادی قوانین کے علم کے پھیل جانے کے بعد یہ توہمات خود بخود ختم ہوگئے ۔ نفسیات انسانی کے قوانین کی لاعلمی کی حالت میں انسانی دنیا کو سمجھنے کے لئے تاریخ کے ایک فلسفی کی ذہنی کوشش ایسی ہی پسماندہ اور مضحکہ خیز ہوگی جیسی کہ ان لوگوں کی ذہنی کاوش پسماندہ اور مضحکہ خیز تھی جنہوں نے مادی قوانین کی لاعلمی کی حالت میں مادی دنیا کے مظاہر کو دیوتاؤں کے دخل و عمل کا نتیجہ قرار دیا تھا۔ اگر ہم تاریخ کے ایسے فلسفی کے بارہ میں اپنا فیصلہ صادر کرتے ہوئے اس حد تک جانا نہ چاہیں تو پھر بھی یہ بات ظاہر ہے کہ تاریخ کا ایسا فلسفی چونکہ تاریخی

واقعات کے صرف ایک پہلو یعنی خارجی پہلو کو ہی دیکھتا ہے لہذا وہ ان سے صحیح نتائج اخذ نہیں کرسکتا۔

انسان کی حکمران خواہش کو دریافت کرنے کے لئے ہمیں یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ انسان کی فطرتی خواہشات کون کون سی ہیں ؟ عصر جدید کے حکماء اور ماہرین نفسیات اس بات پر متفق ہیں کہ انسان کی فطرتی خواہشات کا ایک طبقہ تو وہ ہے جنہیں ہم جبلتی خواہشات کہتے ہیں اور جو انسان اور حیوان دونوں میں مشترک ہیں مثلاً خوراک کی خواہش، جنسی ملاپ کی خواہش، گریز کی خواہش، غلبہ یا استیلاء کی خواہش، دفع مضرت اور جلب منفعت کی خواہش وغیرہ۔ جدید حکماء اور ماہرین نفسیات اس بات پر بھی متفق ہیں کہ انسان کی فطرتی خواہشات کا ایک بلند تر طبقہ بھی ہے جو انسان کا خاص امتیاز ہے اور جس میں انسان سے پست تر درجے کے حیوانات اس کے ساتھ شریک نہیں۔ ان خواہشات میں سے سب سے بڑی اور سب سے زیادہ طاقتور خواہش کسی تصور حسن و کمال یا نصب العین کی محبت ہے لیکن افسوس ہے کہ دور حاضر کے حکماء اس بات پر متفق نہیں کہ وہ خواہش جو انسان کی تمام دوسری خواہشات پر حکمران ہے، کون سی ہے ؟ لہذا انسان کی فطرت ان حکماء کے لئے ابھی تک ایک معمہ بنی ہوئی ہے۔ ایک فلسفی کہتا ہے کہ انسان کے اعمال کی قوت محرکہ اقتصادی ضروریات کی خواہش ہے، اسی خواہش سے اس کی ساری زندگی معین ہوتی ہے اور نصب العین یا تصور حسن و کمال کی خواہش انسان کی اقتصادی ضروریات کی پیداوار ہے اور انہی ضروریات کی خدمت گزار اور فرمان بردار ہے، یہ فلسفی کارل مارکس ہے۔ ایک دوسرا فلسفی یہ سمجھتا ہے کہ انسان کے اعمال کی قوت محرکہ اس کی وہ خواہش ہے جسے جنسیت کہا جاتا ہے۔ اس کے خیال میں انسان کے تمام اعمال آخرکار اسی خواہش کے منبع سے سرزد ہوتے ہیں اور رہی تصور حسن و کمال کی خواہش یہ بھی انسان کے اندر موجود ہے لیکن جنسی خواہشات سے پیدا ہوتی ہے اور انہی کی خدمت گزار اور حاشیہ بردار ہے۔ یہ فلسفی جس کا پیدا کیا ہوا ادب اس زمانے میں بیحد مقبول ہوا ہے فرائیڈ ہے۔ فرائیڈ کے ایک شاگرد ایڈلر نے اپنے استاد کے بالمقابل انسان کے اعمال کی قوت محرکہ کا ایک اور ہی نظریہ پیش کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یہ قوت غلبہ اور تفوق کی خواہش ہے اور اسی خواہش سے انسان کی ساری زندگی صورت پذیر ہوتی ہے۔ تصورات حسن و کمال اسی خواہش سے پیدا ہوتے ہیں کیونکہ انسان جس قسم کا تفوق یا غلبہ چاہتا ہے اسی قسم

کا تصور حسن و کمال اپنے پاس سے اختراع کرکے اپنے سامنے رکھ لیتا ہے اور پھر ساری عمر اسی کا تتبع کرتا رہتا ہے۔ ایک اور ماہر نفسیات میکڈوگل یہ سمجھتا ہے کہ انسان کے اعمال کو حرکت میں لانے والی خواہش ایک نہیں بلکہ تمام جبلتی خواہشیں ہیں اس کا خیال یہ ہے کہ نصب العین کی خواہش کا سرچشمہ بھی یہی جبلتیں ہیں جو متحد ہوکر اپنے آپ کو گویا اپنے ایک کیمیاوی مرکب میں کھو دیتی ہیں۔ میکڈوگل جبلتوں کے اس کیمیاوی مرکب کو جذبۂ ذات اندیشی کہتا ہے۔ یہ جذبہ جبلت تفوق سے مل کر انسان کے اس عمل کو پیدا کرتا ہے جو نصب العینی خواہش کی تکمیل کے لئے سرزد ہوتا ہے۔ گویا ان تمام حکماء اور فطرت انسانی کے رموز و اسرار کا مطالعہ کرنے والے علماء کا خیال یہ ہے کہ انسان کے اعمال کی قوت محرکہ اس کی حیوانی جبلتوں میں سے کوئی ایک جبلت ہے یا تمام جبلتیں ہیں۔ اور نصب العین کی محبت یا خواہش انسان کی حیوانی جبلتوں کی ہی پیداوار ہے۔ اگر ہم ان حکماء کے نظریات کا بغور مطالعہ کریں تو ہمیں یہ معلوم کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی کہ انہوں نے اپنے استدلال میں جابجا ٹھوکریں کھائی ہیں اور ان کے نظریات علمی اور عقلی اعتبار سے حد درجہ ناہموار اور ناقابل بخش ہیں۔ تاہم ان حکماء میں سے صرف کارل مارکس ہی ہے جس نے انسانی اعمال کی قوت محرکہ کے اپنے نظریہ کی بنیاد پر ایک فلسفۂ تاریخ تعمیر کیا ہے جسے جدلی مادیات یا (Dialectical Materialism) کہا جاتا ہے۔ بلکہ نصف درجن عمرانی حکماء یا فلاسفۂ تاریخ میں سے جن میں شپنگلر، ٹائنبی اور سوروکن (Sorokin) بھی شامل ہیں صرف کارل مارکس ہی ایک ایسا حکیم ہے جس نے اپنے فلسفۂ تاریخ کی بنیاد فطرت انسانی کے ایک واضح نظریہ پر رکھی ہے لیکن چونکہ بدقسمتی سے اس کا فطرت انسانی کا نظریہ غلط ہے اور علمی اور عقلی معیاروں پر پورا نہیں اترتا لہذا اسکا نظریہ تاریخ بھی غلط ہوکر رہ گیا ہے۔

انسان کے اعمال کی قوت محرکہ کے متعلق قرآن کا نظریہ ان تمام نظریات سے مختلف ہے۔ قرآن کے نزدیک انسان کے اعمال کی قوت محرکہ اس کی کوئی ایک جبلت یا بہت سی جبلتیں نہیں بلکہ خود تصور حسن و کمال یا نصب العین کی خواہش ہے جو دور حاضر کے تمام حکماء کے نزدیک بھی انسان کو حیوان پر امتیاز بخشتی ہے اور قرآن ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ وہ نصب العین جو اس خواہش کو مستقل اور مکمل طور پر مطمئن کرتا ہے خدا کا نصب العین ہے۔ اس خواہش کی تشفی کا ہی دوسرا نام دین کی پیروی ہے اور

یہی عبادت ہے جسے قرآن انسان کی پوری فطرت قرار دیتا ہے جس پر انسان کو پیدا کیا گیا اور جو کسی حالت میں تبدیل نہیں ہوتی۔ چنانچہ قرآن کا ارشاد ہے :

اقم وجهك للدين حنيفا فطرة الله التي فطر الناس عليها لا تبديل لخلق الله ذالك الدين القيم

اے پیغمبر خدا کی عبادت پر یکسوئی سے قایم رہو یہ وہی فطرت انسانی ہے جس پر خدا نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ پیدائشی تقاضے بدلا نہیں کرتے لہذا یہ دین پکی بنیاد پر ہے۔

گویا قرآن کے نزدیک دین کی پیروی یا عبادت کی خواہش جو انسان کی اعمال فطرت میں رکھی گئی ہے انسان کے اعمال کی قوت محرکہ اور اسکی زندگی کا مدار اور محور ہے

ایک اور جگہ قرآن نے اسی مضمون کو اور بھی وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے :

وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون

میں نے جنوں اور انسانوں کو سوائے عبادت کے اور کسی کام کیلئے پیدا نہیں کیا۔

ایک اور جگہ قرآن حکیم نے ایک قصہ کے پیرایہ میں اوپر کی آیت کے مضمون کی تائید اس طرح سے کی ہے :

واذا خذ ربك من بنى آدم من ظهورهم ذريتهم واشهدهم على انفسهم الست بربكم قالوا بلى شهدنا

جب تیرے پروردگار نے بنی آدم کو ان کی پیٹھوں سے اکٹھا کرکے ان پر گواہ بنایا اور پوچھا کہ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں تو سب نے کہا ہاں ہم گواہ ہیں تو ہمارا پروردگار ہے۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ قول اور فعل میں خدا کی ربوبیت کا اقرار انسان کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ حضور کی کئی احادیث ایسی ہیں جو قرآن کے اس مضمون کی مزید وضاحت کرتی ہیں مثلاً :

کل مولود یولد علی فطرۃ الاسلام فابواہ یھودانہ او ینصرانہ اویمجسانہ

ہر بچہ فطرۃ اسلام پر پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے والدین اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بناتے ہیں ۔

ایک حدیث قدسی ہے :

قال اللہ عزو جل خلقت عبادی حنفاء فجأتھم الشیاطین فاجتالتم عن دینھم و حرمت علیھم ما احللت لھم ۔

اللہ تعالی عزوجل فرماتے ہیں میں نے اپنے بندوں کی فطرت میں خدائے واحد کی خواہش رکھی لیکن شیاطین نے آکر ان کو اپنے فطرتی دین سے گمراہ کردیا اور وہ ان چیزوں کو حرام سمجھنے لگے جو میں نے ان پر حلال کی تھیں ۔

لیکن کیا ان آیات و احادیث سے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست ہوگا کہ قرآن کے نزدیک انسان کی فطرت کا کچھ حصہ تو عبادات کے لئے بنایا گیا ہے اور کچھ اس کی دوسری حیوانی قسم کی ضروریات و خواہشات کے لئے وقف رکھا گیا ہے کیا انسان کی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے بعض افعال اور اعمال تو عبادات کے طور پر ہوں اور بعض عبادات کے طور پر نہ ہوں کہ وہ شب و روز کے اوقات میں سے کچھ حصہ تو خدا کی عبادت کے لئے صرف کرے اور باقی اوقات میں عبادات کے علاوہ اور جو چاہے کرتا رہے ۔

اس سوال کا جواب نفی میں ہے ۔ قرآن کہتا ہے کہ انسان کی فطرت اس طرح سے بنائی گئی ہے کہ وہ خدا کی عبادت کے سوائے اور کچھ کر ہی نہیں سکتا ۔ ضروری ہے کہ اس کی ساری زندگی یعنی اس کی زندگی کا ہر فعل خدا کی عبادت کے جذبہ سے نمودار ہو اور اس کی عبادت پر مشتمل ہو ۔ قرآن کا یہ دعوی نہایت انقلاب انگیز ہے اور فطرت انسانی کے تمام قدیم و جدید فلسفیانہ نظریات کے لئے دعوت مبارزت ہے لیکن اس کے باوجود قرآن کا دعوی یہی ہے اس سے ایک ذرہ بھی کم نہیں ۔ آیت :

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون

میں نے جنوں اور انسانوں کو عبادت کے سوا اور کسی بات کے لئے پیدا نہیں کیا ۔

س آیت میں ما اور الا کے الفاظ سے قرآن کا یہ دعویٰ صاف ظاہر ہے اور پھر خدا کی عبادت کی مثال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے اور آپ کو یہ حکم دیا گیا تھا :

قل ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العالمین	بے شک میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت سب اللہ کے لئے ہیں جو اہل جہان کا پروردگار ہے ۔

جب ہم اس نظریہ کو واضح طور پر سمجھنے کے لئے اس پر مزید غور و فکر کرتے ہیں تو سب سے پہلا سوال جو ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ خدا کے معنی کیا ہیں اور عبادت کے معنی کیا ہیں ؟

قرآن کی رو سے خدا کے معنی وہ ذات ہے جو تمام ایسے اوصاف کی مالک ہو جو تعریف و ستائش کے قابل ہیں ۔ قرآن ان اوصاف کو اسمائے حسنیٰ کہتا ہے اور ان کی ایک فہرست مہیا کرتا ہے ان میں سے بعض یہ ہیں :۔ خالق (پیدا کرنے والا) رب (ربوبیت کرنے والا)، رحمن (عام مہربانی کرنے والا)، رحیم (رحم کرنے والا) کریم (کرم کرنے والا) قدیر (قدرت والا) علیم (جاننے والا) حق (سچ)، حی (زندہ)، قیوم (قائم رکھنے والا) وغیرہ ۔

باقی رہا یہ سوال کہ خدا کو کیا کہا جائے اللہ یا گاڈ یا رحمن یا خدا ۔ قرآن کے نزدیک یہ بات چنداں اہمیت نہیں رکھتی ۔ چنانچہ ارشاد ہے :

قل ادعو اللہ او ادعوا الرحمان ایاما تدعو افلہ الاسماء الحسنی	کہو خدا کو اللہ کہو یا رحمان کہو یا کسی اور نام سے پکارو اس پر کچھ موقوف نہیں صرف اتنا یاد رہے کہ تمام اچھے اوصاف بغیر کسی استثنیٰ کے صرف اللہ کے اوصاف ہیں کسی اور کے نہیں ۔
لہ الاسماء الحسنی فادعوہ، بہا	تمام اچھی صفات اللہ کی ہی صفات ہیں اسے ان صفات سے پکارو
الحمد للہ	سب تعریف اللہ کے لئے ہے !

ان آیات کا مطلب نہ صرف یہ ہے کہ تمام قابل تعریف صفات اللہ کی صفات ہیں بلکہ ان کا مطلب یہ بھی ہے کہ یہ صفات اللہ کے سوائے اور کسی میں موجود نہیں اور اگر وہ کسی دوسرے میں موجود ہیں تو اس کی صفات کا ایک پرتو ہیں اور عارضی اور جزوی طور پر اسی کی عطا کی ہوئی ہیں لہذا درحقیقت وہ اس کی صفات نہیں ۔ بلکہ اللہ ہی کی صفات ہیں ۔ اور جب تمام قابل تعریف صفات صرف ایک ہی ذات میں موجود ہیں تو لازماً حسن یا جمال کی اصطلاح صرف اسی ذات کے لئے صحیح طور پر برتی جاسکتی ہے ۔ وہی ذات حسن کا مبداء اور منتہا ہے وہی ذات حسن و جمال حقیقی ہے ۔ اب غور کیجئے حسن کیا ہے؟

حسن وہ چیز ہے جو ہمیں محبت پر مجبور کرتی ہے لہذا حسن کے اندر کمال بھی شامل ہے کیونکہ نقص سے محبت کرنا ممکن نہیں ۔ حسن کا احساس بے اختیار محبوب کی تعریف اور ستائش کرنے، اس سے قریب ہونے، اس کے سامنے عجز و نیاز کا اظہار کرنے، اس کی خدمت اور اطاعت کرنے، اور ہر آن اور ہر لمحہ اس کی رضامندی کی جستجو کرنے پر آمادہ کرتا ہے ۔ اسی چیز کا نام ''عبادت،، ہے ۔ جس کی خواہش قرآن کی رو سے انسان کے سارے اعمال کی جڑ ہے اگر حسن عبادت کی خواہش پیدا نہیں کرسکتا تو وہ حسن ہی نہیں اور ضروری ہے کہ ہمارے دل میں اس کے کسی نقص کا خیال موجود ہو ۔ عبادت کی اصل یا جڑ احساس حسن ہے جس کا دوسرا نام محبت ہے ۔ معبود وہی ہے جو محبوب بھی ہو اگر محبوب فی الحقیقت محبوب ہے تو ضروری ہے کہ وہ معبود بھی ہو اور قرآن اس کی تصدیق ان الفاظ میں کرتا ہے :

والذین آمنوا اشد حباً للہ	ایمان لانے والے خدا سے شدید محبت رکھتے ہیں ۔

ان حقائق کی روشنی میں ہم انسانی اعمال کی قوت محرکہ کے متعلق قرآن کے نظریہ کو مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کرسکتے ہیں ۔

''خدا کی محبت انسان کے تمام اعمال کا سرچشمہ ہے،،

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر خدا کی عبادت انسان کی فطرت ہے اگر خدا کی محبت انسان کے تمام اعمال کا سرچشمہ ہے تو ہر انسان اپنی ساری

زندگی کو خدا کی محبت یا عبادت کے لئے وقف کیوں نہیں کردیتا ؟ یہ مان لیا کہ جو لوگ خدا پر ایمان لاتے ہیں اور خدا کی عبادت کرتے ہیں وہ اپنی فطرت کا اظہار ٹھیک طرح سے کرتے ہیں لیکن اس زمانہ میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو خدا پر ایمان نہیں لاتے یا عملاً کافر ہیں اور خدا کی عبادت نہیں کرتے ایسے لوگوں کی فطرت کہاں غائب ہو جاتی ہے اور انسان ہونے کے باوجود وہ انسانی فطرت کا جامہ اتارنے میں کس طرح کامیاب ہو جاتے ہیں ؟

قرآن اس سوال کا یہ جواب دیتا ہے کہ کسی انسان کی فطرت غائب نہیں ہوسکتی کوئی انسان اپنی فطرت کا جامہ اتار نہیں سکتا کیونکہ فطرت انسانی کے قوانین غیر مبدل ہیں ۔

لاتبدیل لخلق اللہ — پیدائشی تقاضے بدلا نہیں کرتے ۔

قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ منکرین کے دل میں بھی خدا اور اس کے اوصاف کی محبت بدستور رہتی ہے اور ان کی زندگی کے تمام اعمال بھی اسی محبت کے سرچشمہ سے پیدا ہوتے ہیں ۔ گویا ان کی زندگی بھی عبادت ہی کے لئے وقف رہتی ہے لیکن ان کی صورت میں ہوتا یہ ہے کہ وہ سچے خدا سے جو فی الحقیقت تمام اوصاف حسن کا مالک ہے آشنا نہیں ہوتے لہذا وہ اپنی فطرت کے تقاضائے عبادت سے مجبور ہو کر کسی اور تصور کو خدا سمجھ لیتے ہیں اور پھر اس خود ساختہ خدا کی طرف وہ تمام اوصاف حسن منسوب کرتے ہیں جن کا مالک فقط سچا خدا ہے اور پھر اس کی خدمت اور اطاعت کرتے ہیں اس کے آگے عجز و نیاز کا اظہار کرتے ہیں، اس کی تعریف و ستائش کرتے ہیں اس کی رضامندی اور پسندیدگی کی جستجو کرتے ہیں اور اس کا قرب ڈھونڈھتے ہیں ۔ غرض اس جھوٹے خدا کے لئے ان کی محبت اور عبادت کے تمام فطری تقاضے اپنا کام بالکل اسی طرح سے کرتے ہیں جس طرح سچے خدا کے لئے ایک مومن کی فطرت کے تقاضے اپنا کام کرتے ہیں ۔ صرف ان لوگوں کی صورت میں ان کا مرجع یا محرک یا مظہر اور ہوتا ہے ۔ قرآن نے اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے :

ومن الناس من یتخذ من دون اللہ اندادا یحبونھم کحب اللہ والذین آمنوا اشد حبا للہ

ان لوگوں نے خدا کو چھوڑ کر دوسرے تصورات کو اپنا معبود بنالیا ہے وہ اپنے ان معبودوں سے ایسی ہی محبت کرتے ہیں جو

صرف خدا سے کرنی چاہئے لیکن
وہ لوگ جو خدا پر ایمان لائے
ہیں خدا سے شدید محبت کرتے ہیں

قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ یہ جھوٹے خدا رب السموات والارض اور خدائے واحد قہار ہی کی طرح کے رب مانے جاتے ہیں اور ان کو رب کہا جاتا ہے گو ان کے اندر رب کی صفات موجود نہیں ہوتیں تاہم ان کو ماننے والا ان کے اندر ان اوصاف کی موجودگی خواہ مخواہ فرض کر لیتا ہے ۔

یصاحبي السجن آ ارباب متفرقون خیرام
الله الواحد القهار
ما تعبدون من دونه الاالاسماء سمیتموها
انتم و آباءکم

اے قید خانہ کے ساتھیو کیا عبادت
کے لئے بہت سے رب اچھے ہیں یا
ایک ہی غالب خدا اچھا ہے تم
اسے چھوڑ کر فقط ناموں کی عبادت
کرتے ہو جو تم نے اور تمہارے
آبا و اجداد نے وضع کرلئے ہیں
(کیونکہ ان میں رب کی صفات
درحقیقت موجود نہیں)

انسان نے اپنی تاریخ میں کئی قسم کے جھوٹے خداؤں کی عبادت کی ہے اور اب بھی کر رہا ہے، شمس، درخت، دریا، پہاڑ ہاتھ سے تراشے ہوئے بت سب اس کے خدا بنے رہے ہیں ۔کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنی سفلی خواہشات کی لذت، کو حرص و ہوا کو، شہرت، حکومت ،یا دولت کو، لوگوں کی رضامندی یا پسندیدگی کو، یا بیوی یا اولاد کو، یا کسی دوست یا افسر کو، اپنا خدا سمجھ لیتا ہے، اس عہد میں اس کے جھوٹے خداؤں نے ازموں (isms) کی صورت اختیار کی ہے مثلاً نیشنلزم، کمیونزم، نازی ازم، فاشزم، ھیومنزم، عروبہ یا عرب ازم، بعض لوگوں کے خدا ہیں !

بعض وقت جھوٹے خداؤں کو ماننے والے لوگ اپنے خدا کو خدا نہیں کہتے لیکن عملی طور پر ان کو خدا سمجھتے ہیں ۔ وہ خدا کی اصطلاح عام طور پر سچے خدا کے لئے رہنے دیتے ہیں لیکن سچے خدا کی صفات اس سے چھین کر اپنے جھوٹے خدا کو سونپ دیتے ہیں ۔ تاہم ہر شخص کا خدا وہی ہے جسے وہ عملی طور پر خدا مانتا ہے اور جس کی طرف وہ عملی طور پر صفات حسن منسوب کرتا ہے ۔ حکماء نے اس قسم کے خدا کے لئے آئیڈیل یا نظریہ یا نصب العین

یا آدرش کی اصطلاح وضع کی ہے۔ کسی شخص کا آدرش وہ تصور ہوتا ہے جس کی محبت اس کی زندگی کے تمام اعمال کو پیدا کرتی ہے اور جسے وہ اپنے محبوب یا معبود کا درجہ دیتا ہے خواہ وہ اسے خدا کا نام نہ دے اگر ہم اس اصطلاح کو کام میں لائیں تو اب تک ہم جن نتائج کو پہنچے ہیں ان کے مطابق انسانی اعمال کی قوت محرکہ کے متعلق قرآن کا نظریہ اس طرح سے بیان کیا جاسکتا ہے کہ :

> "آئیڈیل یا نصب العین کی محبت کا جذبہ انسان کے سارے اعمال کا سرچشمہ ہے یہ جذبہ ایسا ہے کہ اگر انسان اس کے اظہار کا صحیح طریق نہ جانتا ہو تو اس کا اظہار غلط طریق سے کرتا ہے یعنی ایک غلط تصور کو اپنا نصب العین بنا لیتا ہے۔ پھر خدا کی تمام صفات اس کی طرف منسوب کرتا ہے اور اس کی عبادت و اطاعت اس طرح کرتا گویا وہ سچ مچ کا خدا ہے اور خدا کی صفات کا مالک ہے لیکن صحیح کامل اور سچا نصب العین اس ہستی کا تصور ہے جو اس کائنات کی خالق ہے، جو رب ہے، رحمن و رحیم ہے، حی و قیوم ہے، علیم و قدیر ہے اور فرضی طور پر نہیں بلکہ حقیقی طور پر تمام صفات حسن و کمال کی مالک ہے"۔

نصب العین کی خواہش چونکہ انسان کے سارے اعمال کی قوت محرکہ ہے، اس خواہش کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اسے روکنا ممکن نہیں اگر فرد کی یہ خواہش کامل نصب العین سے مطمئن نہ ہوسکے، اس لئے کہ فرد کو اس نصب العین کا علم یا اس کے حسن و کمال کا احساس ابھی نہیں ہوا تو پور اسکی یہ خواہش کسی اور غلط نصب العین کی راہ سے (جو اسے اپنے تمام معلوم تصورات میں سے زیادہ حسین اور کامل نظر آتا ہو) اظہار پانے لگتی ہے۔ اسے ایک غلطی کی بناء پر اس تصور میں تصور کامل کی بعض صفات حسن و کمال کی موجودگی کا واضح اور شعوری احساس ہوتا ہے۔ لہذا ان صفات کی کشش کی وجہ سے اور اپنی آرزوئے حسن کو پوری طرح سے مطمئن کرنے کے لئے وہ یہ فرض کر لیتا ہے کہ اس میں تصور کامل کی وہ تمام صفات حسن و کمال موجود ہیں جن کی طلب اس کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے۔ اس طرح سے وہ اس تصور کی طرف باقی ماندہ صفات حسن و کمال کو یعنی ان صفات کو جو اسے واضح طور پر اور شعوری طور پر اس میں نظر نہ آ رہی ہوں غیر واضح اور غیر شعوری طور پر منسوب کرکے اپنی غلطی کو مکمل کر لیتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ

اس تصور کو اپنا سچ مچ کا خدا بنا لیتا ہے۔

تاہم کچھ عرصہ کے بعد جب وہ اپنے اس نصب العین یا خدا سے رسم و راہ پیدا کرتا ہے اور اسے قریب سے دیکھنے اور پرکھنے کا موقع پاتا ہے تو اس پر اپنے نصب العین کے مخفی نقائص آشکار ہو جاتے ہیں۔ یہ نقائص ان صفات حسن و کمال سے بھی ٹکراتے ہیں جو اسے نصب العین میں پہلے واضح طور پر نظر آئے تھے اور جن کی وہ اس کی طرف شعوری طور پر منسوب کر رہا تھا۔ لہٰذا وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اس نصب العین میں درحقیقت کوئی صفات حسن و کمال موجود نہیں۔ اور اس سے بیزار ہوکر ایک اور نصب العین اختیار کرتا ہے جس کے متعلق اس کا گمان یہ ہوتا ہے کہ اس میں وہ نقائص موجود نہیں جو اس کے پہلے نصب العین میں موجود تھے۔ اگر اس اثناء میں وہ تصور کامل سے آشنا نہ ہوا ہو یعنی اس کی صفات حسن و کمال کے ذاتی احساس سے بہرہ ور نہ ہوا ہو تو اس کا انتخاب پھر غلط ہو جاتا ہے۔

تجربہ اور خطا کا یہ عمل جس میں فرد ایک نصب العین کو چنتا ہے، اس سے محبت کرتا ہے اور اپنی زندگی کو اس کے لئے وقف کرتا ہے اور پھر اس سے مایوس ہو جاتا ہے اور اسے ترک کرکے اور نصب العین اختیار کرلیتا ہے، برابر جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ تصور کامل کو اپنا نصب العین بنانے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ اس عمل کا باعث انسان کی فطرت کا اندرونی معیار حسن ہے جو اسے تصور کامل کے سوائے اور کسی تصور سے مطمئن نہیں ہونے دیتا۔ قرآن حکیم نے انسان کی فطرت کے اس اندرونی معیار حسن اور اس کے بے پناہ عمل کی طرف حضرت ابراہیم کے اس قصہ میں اشارہ کیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح سے حضرت ابراہیم نے پہلے ایک ستارے کو اور پھر چاند کو اور پھر سورج کو اپنا محبوب اور معبود بنانے سے انکار کیا کہ ان میں کوئی بھی اپنی بلندی اور روشنی کے باوجود ایسا نہیں تھا جو ڈوب نہ جائے۔

فلما افل قال لا احب الافلین — جب وہ ڈوب گیا تو فرمایا کہ میں ڈوبنے والوں سے محبت نہیں کرتا

میں نے اب تک نصب العین کا ذکر اس طرح سے کیا ہے کہ گویا وہ فرد کی کوئی پرائیویٹ اور انفرادی ضرورت یا خواہش ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ جس طرح سے ایک جسم حیوانی اپنی اولاد کی صورت میں جسمانی اور حیاتیاتی

توالد کے ذریعہ سے اپنے جیسے بہت سے افراد پیدا کرتا ہے یہاں تک کہ حیوان کی ایک پوری نوع وجود میں آ جاتی ہے اسی طرح سے چونکہ ہر باپ کی اولاد باپ کے تعلیمی اثر کی وجہ سے باپ کے ہی نصب العین کو اختیار کرتی ہے لہذا ایک نصب العین کو ماننے والا فرد انسانی ایک قسم کے روحانی یا نفسیاتی توالد کے ذریعہ سے اپنی اولاد کی صورت میں اپنے نصب العین کو ماننے والے بہت سے افراد پیدا کرتا ہے یہاں تک کہ ایک پوری نصب العینی جماعت وجود میں آ جاتی ہے پھر یہ جماعت اپنے ارتقائی درجہ کے مطابق خاندان کے بزرگ یا قبیلہ کے سردار یا بادشاہ یا قائد یا ڈکٹیٹر یا پریذیڈنٹ کے ماتحت ایک خاندان یا قبیلہ یا سلطنت یا ریاست کی صورت میں منظم ہو جاتی ہے۔ اس منظم نصب العینی جماعت کے افراد نصب العین کی خدمت کو براہ راست اپنے ماحول سے جس میں انکے والدین، بزرگ، استاد اور راہنما شامل ہوتے ہیں نسلاً بعد نسلاً حاصل کرتے رہتے ہیں اور اس طرح سے جماعت صدیوں تک قایم رہتی ہے۔ ایک فرد کی طرح اس جماعت کے تمام اعمال و افعال نصب العین کی اطاعت اور پیروی میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اس طرح سے نصب العین ان کی عملی زندگی کے تمام اخلاقی، سیاسی، اقتصادی، قومی، علمی، تعلیمی، فنی، اور ثقافتی شعبوں کو معین کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر نصب العینی جماعت رفتہ رفتہ ایک تہذیب یا ثقافت پیدا کرتی ہے جس کے تمام عناصر براہ راست اس کے نصب العین سے ماخوذ ہوتے ہیں۔

لیکن جس طرح سے ایک فرد کا غلط نصب العین تا دیر قایم نہیں رہتا اسی طرح سے ایک منظم نصب العینی جماعت یا قوم کا نصب العین بھی تا دیر قایم نہیں رہتا اور مٹ کر ایک اور نصب العین کے لئے راستہ ہموار کرتا ہے اور جب نصب العین مٹتا ہے تو اس کے ساتھ ہی وہ نصب العینی جماعت یا قوم بھی جو اس نصب العین کی حامل ہو اس نصب العینی جماعت یا قوم کی حیثیت سے مٹ جاتی ہے۔ غلط نصب العین کو ماننے والی قوم اگر کئی صدیوں تک بھی زندہ رہے اور ترقی کرتی رہے تو پھر بھی ایک دن اس کا مرنا اور مٹ جانا ضروری ہے۔ غلط نصب العینوں کی پیروی میں عارضی ترقی کرنے والی قوموں کی آخری موت کے بارہ میں قرآن کا ارشاد ہے۔

لکل امة اجل فاذا جاء اجلهم	ہر گمراہ قوم کے لئے ایک مدت حیات
لایستاخرون ساعة ولا یستقدمون	مقرر ہے جب اس کی مدت حیات

ختم ہو جاتی ہے تو پھر وہ ایک
لمحہ کے لئے بھی آگے یا پیچھے
نہیں ہوسکتی

اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی قوم کا نصب العین فقط افراد کے ذہنوں میں بسنے والا ایک تصور حسن و کمال ہی نہیں ہوتا بلکہ عمل کا ایک ایسا جذبہ ہوتا ہے جو قوم کی خارجی عملی زندگی کے چھوٹے بڑے ہر عنصر میں اپنا اظہار پاتا ہے اور قوم کے حالات اور شؤون میں اسطرح سے جلوہ گر ہوتا ہے جس طرح سے ایک آئینہ کے اندر سامنے کی چیزیں منعکس ہوتی ہیں ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر قوم اپنی زندگی کے حالات میں اپنے نصب العین کی تصویر دیکھتی ہے اور اس کے حسن و قبح کا مشاہدہ کرتی ہے اگر اس کا نصب العین غلط ہو تو قوم اسکے ماتحت کام کرتے ہوئے مجبوراً ایسے سماجی، قومی، اور بین الاقوامی حالات پیدا کردیتی ہے جو اس کے معیار حسن و کمال پر پورے نہیں اترتے اور تسلی بخش نہیں ہوتے لہذا رفتہ رفتہ یہ حالات قوم کو اپنے نصب العین کی طرف سے یہاں تک بدظن کر دیتے ہیں کہ وہ بالآخر اسکو چھوڑ دیتی ہے ۔

چونکہ ایک فرد کی طرح ایک قوم بھی اپنے غلط نصب العین کی طرف بعض صفات حسن و کمال شعوری طور پر منسوب کرتی ہے اور بعض غیر شعوری طور پر لہذا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی ساری کوششیں حسن و کمال کی ان صفات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے صرف کرتی ہے جن کے وجود کا وہ شعور رکھتی ہے اور باقی صفات کو جن کی موجودگی کا شعور یا احساس اسکو نہیں ہوتا نظر انداز کرتی ہے ۔ لیکن چونکہ وہ حسن و کمال کی بعض صفات کو نظر انداز کرتی ہے اس کے لئے ممکن نہیں ہوتا کہ وہ اپنی عملی زندگی کے حالات میں ان تمام صفات حسن کا اظہار کر سکے جن کا اظہار وہ کرنا چاہتی ہے ۔ لہذا ایک قوم کے غلط نصب العین کی فطرت ہی کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد اس قوم کے حالات ہر روز زیادہ سے زیادہ نا تسلی بخش ہوکر سامنے آنے لگتے ہیں اور ہزار کوششوں کے باوجود بھی درست ہونے میں نہیں آتے ۔ یہاں تک کہ بالآخر قوم تباہی سے دو چار ہو جاتی ہے لیکن یہ عمل جس سے ایک قوم اپنے غلط نصب العین سے بیزار ہوکر اسے ترک کردیتی ہے اکثر اوقات نہایت ہی سست ہوتا ہے اور کئی صدیوں میں پھیلا ہوا ہوتا ہے ۔ آغاز محبت میں غلط نصب العین ماننے والوں کی امیدیں بلند ہوتی ہیں ان

کی محبت تازہ اور شگفتہ اور پرجوش ہوتی ہے لہذا وہ اپنے نصب العین کی خدمت پوری تندہی سے کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ وہ سارا حسن و کمال جو وہ اسکی طرف منسوب کرتے ہیں عملی دنیا میں پوری طرح سے آشکار اور اجاگر ہو۔ اس کوشش کے دوران میں قدرتی طور پر وہ اپنے نصب العین کے حسن پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں اور اس سے لذت اندوز ہوتے ہیں۔ لہذا ان کی محبت میں اور اضافہ ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نصب العینی جماعت ہر لحاظ سے ترقی کرتی جاتی ہے اور نصب العین کی ظاہری شان و شوکت اور سج دھج میں متواتر اضافہ ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ پورا حسن و کمال جس کے آشکار کرنے کی صلاحیت اس نصب العین میں ہوتی ہے آشکار ہو جاتا ہے۔ قدرت ہر نصب العین کو خواہ غلط ہو یا صحیح پورا موقع دیتی ہے کہ جس قدر ترقی کرنا اس کے لئے ممکن ہے وہ ترقی کرے اور اس کی ترقی صرف اسوقت رکتی ہے جب خود اس کی اپنی خامیاں یا کمزوریاں اسکو آگے بڑھنے نہیں دیتیں۔ قرآن حکیم نے اس حقیقت کا اظہار یوں فرمایا ہے :

کلا نمد ھؤلاء وھؤلاء من عطاء ربك وماکان عطاء ربك محظوراً

ہم ہر قوم کی امداد کرتے ہیں اسکی بھی جو اچھی ہے اور اس کی بھی جو بری ہے۔ یہ تیرے پروردگار کی بخشش ہے اور تیرے پروردگار کی بخشش محدود نہیں

تاہم رفتہ رفتہ نصب العین کے پوشیدہ نقائص آشکار ہونے لگتے ہیں اور ان کی محبت کو سلب کرنے لگ جاتے ہیں۔ قوم پھر بھی اپنے نصب العین کے ساتھ چمٹی رہتی ہے لیکن نصب العین کے لئے ان کی ستائش میں کمی آ جاتی ہے اور ان کا جوش ٹھنڈا ہونے لگتا ہے اب وہ اپنے نصب العین کے علاوہ دوسرے نصب العینوں کو بھی کسیقدر ستائش کے جذبہ سے دیکھنے لگتے ہیں اب قوم کی طاقت اور نصب العین کی شان و شوکت بڑھنے سے رہ جاتی ہے اور قوم اپنی اس ساکھ اور عزت کے سہارے زندگی بسر کرنے لگ جاتی ہے جسے وہ پہلے کسی وقت اپنی کوششوں سے حاصل کرچکی تھی۔ تاہم دن بدن وہ زیادہ کمزور ہوتی جاتی ہے اور لہذا اپنے نصب العین کیلئے اس کی محبت بھی اسی نسبت سے اور کم ہوتی جاتی ہے۔ پھر اس مرحلہ پر کسی بیرونی دشمن کا زبردست حملہ یا اندرونی باغیوں کا کامیاب انقلاب اسے ہمیشہ کے لئے ختم کردیتا ہے اور ایک نئی نصب العینی قوم اسکی جگہ لینے کے لئے ابھر آتی ہے۔

نصب العین کی محبت کا جذبہ فرد کی زندگی کے آغاز ہی سے اپنا عمل شروع کر دیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے تصورات حسن و کمال اس کے علم اور تجربہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ ترقی کرتے رہتے ہیں اور بدل بدل کر تصور کامل کے قریب آتے جاتے ہیں لیکن بالعموم اس سوسائٹی کے نصب العین تک آکر رک جاتے ہیں جس کا وہ فرد ایک رکن ہوتا ہے۔ فرد بالعموم اپنے آبا و اجداد کے نصب العین سے بلند تر نصب العین کو اختیار نہیں کرسکتا۔

ایک بچے کے لئے سب سے زیادہ تسلی بخش اور باعث اطمینان و مسرت وہ اشیاء ہوتی ہیں جو اس کی جبلتی خواہشات کی تشفی کرتی ہیں مثلاً کھانے پینے کی لذیذ چیزیں۔ لہذا اس کے نصب العین کی محبت سب سے پہلے ایسی ہی اشیاء کی راہ سے اپنا اظہار پاتی ہے اور یہی چیزیں اسکے نصب العین کے عناصر بنتی ہیں۔ جب بچے کی عمر ذرا ترقی کرتی ہے تو چونکہ اس کے والدین اس کے قریب ہوتے ہیں وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ہر بات میں اس سے فائق ہیں اور لہذا نہایت ہی شاندار اور قابل تعریف ہستیاں ہیں۔ لہذا وہ اسکا نصب العین بن جاتے ہیں۔ وہ ان کی رضامندی حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس غرض کیلئے اپنی ان خواہشات کو ضروری حد تک ترک کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے جو پہلے اسکا نصب العین تھیں۔ یعنی کھانے پینے کی لذات وغیرہ۔ اس کے بعد اس کے دل میں اپنے استادوں کی محبت والدین سے بھی بڑھکر پیدا ہوتی ہے اور اس کے استاد اس کا نصب العین بن جاتے ہیں اور وہ انہیں حسن و کمال کا نمونہ سمجھنے لگتا ہے۔

استادوں کے بعد پھر ان قومی مشاہیر و قائدین کی باری آتی ہے جو دوسروں کی ستائش حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے ہوں۔ پھر اپنی عقل کی بلوغت کو پہنچ کر وہ محسوس کرتا ہے کہ ان سب لوگوں میں جو چیزیں واقعی قابل تعریف ہیں وہ حسن و کمال کی صفات مطلقہ ہیں مثلاً صداقت اور نیکی وغیرہ لہذا اسکی محبت۔ نصب العین اشیاء اور افراد سے ہٹکر ایسے تصورات اور نظریات کو اپنا مرجع بناتی ہے جن میں یہ صفات حسن و کمال موجود ہوں۔ مثلاً عیسائیت، جمہوریت، اجتماعیت، عربیت، انتراکیت وغیرہ۔ فرد کی ہمدردی بھی اسکے نصب العین کے ارتقا کے ساتھ ساتھ وسعت پذیر ہوتی جاتی ہے۔ سب سے پہلے اپنی ذات پھر اپنا خاندان اور رشتہ دار پھر ہمسائے اور دوست پھر اسکول اور اپنا شہر اور آخرکار اپنی قوم جو اس کے نصب العین سے محبت کرتی

ہے اسکی ہمدردی کا مرجع بنتے ہیں ۔

نوع میں بھی نصب العینوں کا ارتقا بالکل اس ترتیب سے ہوتا ہے جو فرد کے نصب العینوں کے ارتقا میں نظر آتی ہے گویا فرد نوع کی تاریخ کو نفسیاتی اور انسانی سطح ارتقا پر بالکل اسی طرح سے دہراتا جس طرح کہ وہ اس کو حیاتیاتی اور حیوانی سطح پر دہراتا ہے ۔

ابتدائی انسان کیلئے سب سے زیادہ تسلی بخش اور باعث اطمینان و مسرت وہ اشیاء ہوتی تھیں جن کے ذریعہ سے وہ اپنی جبلتی خواہشات مثلاً خوراک کی طلب وغیرہ کی تشفی کیا کرتا تھا ۔ ہر فرد کی ہمدردیاں اسکی ذات تک محدود رہتی تھیں الا یہ کہ اسکی یہی جبلتی خواہشات انکو دوسروں تک وسعت دینے پر آمادہ کریں ۔ اس کے بعد اس کے دل میں خاندان کے بزرگ کا لحاظ اور احترام پیدا ہوا جس کے لئے وہ کسی حد تک اپنے لحاظ اور احترام کو قربان کرنے لگا اور اپنی جبلتی خواہشات کو خاندان کے بزرگ کی ہدایات کے ماتحت خاندان کے عمومی مفاد کی خاطر ضروری حد تک روکنے لگا ۔ اس کے بعد اس نے خاندان کی بجائے قبیلہ کو اپنا نصب العین اور قبیلہ کے سردار کو اپنا راہ نما بنایا اور یہ بات بھی سیکھ گیا کہ اپنے قبیلہ کی خاطر اپنے خاندانی مفاد کو قربان کرنے لگا ۔ قبیلے بہت سے تھے اور ایک دوسرے سے برسر پیکار رہتے تھے یہاں تک کہ ان پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ قبائلی جنگیں تباہ کن ہیں اور یہ بات ان کے لئے زیادہ تسلی بخش ہے کہ تمام قبیلے ایک بادشاہ کے ماتحت متحد ہو جائیں اس طرح سے انسان کا نصب العین بادشاہت کی جانب منتقل ہوگیا اور انسان بادشاہ کو ظل اللہ کہہ کر خدا کا درجہ دینے لگا لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد بادشاہ کے ظلم نے یہ بات واضح کردی کہ کوئی ایسا نصب العین ان کے معیار حسن پر پورا نہیں اتر سکتا جو ملک کے لوگوں کی سلامتی اور بہتری کو نظرانداز کرتا ہو ۔ اس فیصلہ سے نصب العین بادشاہ سے ہٹ کر پبلک کی طرف اور ملک کے لوگوں کی طرف منتقل ہوگیا یہی نصب العین ہے جو اس وقت لادینی قومیت اور لادینی وطنیت کے ناموں سے تعبیر کیا جاتا ہے ملک کے لوگوں کی سود و بہبود کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اپنے آپ پر خود حکومت کریں لہذا کچھ عرصہ کے بعد قومیت کا نظریہ جمہوریت، آزادی، مساوات اور اخوت کے حسین ناموں سے تعبیر ہونے لگا ۔

لیکن پہلی جنگ عظیم تک ان حسین ناموں کا دائرہ عمل کسی خاص ملک کے لوگوں تک محدود رہتا تھا جو خاص جغرافیائی حدود میں بستے

تھے اور خاص قسم کی علامات رکھتے تھے لیکن اس جنگ کے بعد انسان کے نصب العینوں نے ایک اہم قدم آگے اٹھایا اور وہ زندگی کے فلسفوں کی صورت میں سامنے آنے لگے ۔ پہلا فلسفہ' زندگی جس نے سیاسی نصب العین کا مقام حاصل کیا روس کا نظریہ' اشتراکیت تھا ۔ فرد کی طرح نوع کی صورت میں بھی نصب العین اپنی صفات میں تصور کامل کی طرف جو خدا کا تصور ہے ترقی کرتے رہتے ہیں ۔

یہ ہے قرآن کے نقطہ' نظر سے وہ عمل جس سے تہذیبیں، ثقافتیں اور قومیں وجود میں آتی ہیں، ترقی کرتی ہیں، اپنی شان و شوکت کے کمال پر پہنچتی ہیں اور پھر زوال پذیر ہوتی ہیں اور ہمیشہ کیلئے مٹ جاتی ہیں اور نئی تہذیبیں اور ثقافتیں اور قومیں ان کی جگہ لینے کے لئے پیدا ہوتی ہیں اور پھر تاریخ کے اسی عمل کو دہراتی ہوئی نوع انسانی کو اس کے آخری اور کامل نصب العین یعنی خدا کے نصب العین سے قریب کرتی جاتی ہیں ۔

صرف خدا کا نصب العین ہی ایک ایسا نصب العین ہے کہ جب وہ کسی قوم کی عملی زندگی کے تمام ضروری شعبوں میں ایک دفعہ اپنا اظہار پالے تو پھر نہ تو وہ قوم ہی مٹتی ہے اور نہ اسکا نصب العین ۔

قرآن حکیم نے کامل نصب العین کی بناء پر قایم ہونے والی تہذیب کی پائداری اور ناقص نصب العینوں کی ناپائداری کا ذکر بار بار کیا ہے ۔

الم ترکیف ضرب اللہ مثلا کلمة طیبة کشجرہ طیبة اصلها ثابت وفرعها فی السماء وتؤتی اکلها کل حین باذن ربها ویضرب اللہ الامثال للناس لعلهم یتذکرون ومثل کلمة خبیثة کشجرة خبیثةن اجتثت من فوق الارض مالها من قرارہ یثبت اللہ الذین آمنوا بالقول الثابت فی الحیوة الدنیا وفی الاخرة ویضل اللہ الظالمین ویفعل اللہ مایشاء

کیا تونے نہیں دیکھا کسطرح سے اللہ نے ایک سچے نصب العین کی مثال ایک پاکیزہ درخت سے دی ہے جس کی جڑیں مضبوط ہوں اور جس کی شاخیں آسمان سے باتیں کر رہی ہوں جو خدا کے حکم سے ہر آن اپنا پھل لاتا رہے ۔ خدا لوگوں کے لئے امثال بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت اندوز ہوں اور ایک غلط، ناپاک اور ناقص نصب العین کی مثال ایک ضرر رساں درخت کی طرح جسے بیکار سمجھ کر زمین سے اکھاڑ دیا جاتا ہے اور جسے کوئی

پائیداری حاصل نہیں ہوتی (حاصل یہ کہ) خدا مسلمانوں کو ان کے پائیدار نصب العین کی وجہ سے دنیا اور آخرت دونوں میں پائیداری عطا کرتا ہے اور ظالموں کو یعنی اپنے جذبۂ حسن کا ناجائز استعمال کرنے والوں کو غلط راہ پر لے جاتا ہے اور خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

ومن یکفر بالطاغوت ویؤمن باللہ فقد استمسک بالعروۃ الوثقیٰ لاانفصام لہا واللہ سمیع علیم

جو غیر اللہ سے کفر کرتا ہے اور خدا پر ایمان لاتا ہے اس نے ایک مضبوط سہارے کو تھام لیا جو کبھی نہیں ٹوٹ سکتا اور اللہ سنتا بھی اور جانتا بھی ہے۔

مثل الذین اتخذوا من دون اللہ اولیاء کمثل العنکبوت اتخذت بیتا ان اوھن البیوت لبیت العنکبوت لو کانوا یعلمون

ان لوگوں کی مثال جنہوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسروں سے محبت اور دوستی کے تعلقات قایم کئے ہیں اس مکڑی کی طرح ہے جس نے اپنا گھر بنایا ہے بیشک گھروں میں سے کمزور ترین گھر مکڑی کا ہوتا ہے۔ کاش کہ وہ جانیں!

مثل الذین کفروا بربہم اعمالہم کرماد ن اشتدت بہ الریح فی یوم عاصف لایقدرون مما کسبوا علی شیٔ لہ دعوۃ الحق والذین یدعون من دونہ لایستجیبون لہم بشیٔ الا کباسط کفیہ الی الماء لیبلغ فاہ وما ہو ببالغہ

کافروں کے اعمال اس راکھ کی طرح ہیں جس پر آندھی کے روز ہوا تیزی سے چلے وہ اپنے کئے میں سے کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتے صحیح اور سچی پکار وہی ہے جو اس کے لئے ہو جو اسے چھوڑ کر دوسروں کو پکارتے ہیں وہ دوسرے ان کی حاجت روائی نہیں کرسکتے اور اس کے سوائے ان کی کوئی مثال نہیں دی جاسکتی

کہ وہ اس شخص کی طرح ہیں جو
اپنا ہاتھ پانی کی طرف بڑھاتا ہے
تا کہ وہ اس کے منہ تک پہنچے حالانکہ
وہ اس کی پہنچ سے باہر ہے۔

قرآن حکیم نے یہ صاف اعلان کیا ہے کہ وہ دین حق جو خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا ہے تابم رہنے والا اور دوسرے تمام ادیان پر غالب آنے والا ہے۔ اور اس دین کا غلبہ ہر حالت میں ہو کر رہے گا اگرچہ کفار اسے ناپسند ہی کریں۔

یریدون ان یطفوا نور اللہ بافواھم و یابی اللہ الا ان یتم نورہ ولو کرہ الکفرون

کفار چاہتے ہیں کہ خدا کے نور کو اپنے منہ کی پھونکوں سے بجھادیں لیکن خدا اس کے برعکس یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے نور کی تکمیل کرے اگرچہ کافر ناپسند کرتے ہوں۔

ھوالذی ارسل رسولہ، بالھدی و دین الحق لیظھرہ، علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون

خدا وہ ذات پاک ہے جس نے اپنے رسول کو سچے دین اور ہدایت کے ساتھ بھیجا تا کہ اس کو تمام دوسرے ادیان پر غالب کرے اگرچہ مشرکین اس بات کو ناپسند کرتے ہوں۔

وکتبنا فی الزبور من بعد الذکران الارض یرثھا عبادی الصالحون

اور ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد یہ بھی لکھ دیا تھا کہ میرے اچھے بندے ہی زمین کے وارث ہونگے

انتم الاعلون ان کنتم مومنین

اگر تم سچے خدا پر ایمان رکھوگے تو تم ہی غالب رہوگے

کتب اللہ لاغلبن انا و رسلی

خدا نے یہ لکھ دیا ہے کہ میں اور میرے رسول ہی دوسروں کے بالمقابل غالب رہیں گے

اقبال قرآن کے اسی مفہوم کو نظم کرتا ہے جب وہ چینیوں، ساسانیوں، رومیوں، یونانیوں اور تاتاریوں کی تہذیبوں کی ناپائیداری کا ذکر کرنے کے بعد اسلام کی پائیداری کا ذکر کرتا ہے:

در جہاں بانگ اذاں بود است وھست
ملت اسلامیاں بود است وھست

پہ جب وہ کہتے ہے :

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری،
صدیوں رہا ہے دشمن دور زماں ہمارا

تبصرہ

روزگار فقیر
فقیر سید وحید الدین
ناشر سید وحید الدین
صفحات ۲۵۶
قیمت سات روپے پچاس پیسے

اقبال کے فکر و فلسفہ، پیغام و شاعری پر اب تک جو کچھ لکھا گیا اس کا ایک بڑا حصہ محض تخلیقات کا تجزیہ ہے۔ تخلیق کے ادراک کے لئے خالق سے شناسائی کو شاذ ہی ضروری سمجھا گیا ہے۔ اس سے ہٹ کر ٹھیٹھ سوانحی تحریروں میں ان کی ذات کے باطنی عناصر اور ان کی شخصیت کی غیر معروف گہرائیوں کا سراغ لگانے کی کوشش کم ہی نظر آتی ہے۔ اس لحاظ سے روزگار فقیر محض اقبالیات کی ایک بڑی کمی کا ازالہ ہی نہیں بلکہ اردو کے ادبی سرمایہ پر ایک گراں قدر اضافہ بھی ہے۔

ہمارے یہاں کے سوانحی خاکوں میں بڑی احتیاط سے رنگ بھرا جاتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے ایسی تصویریں فن کار کے خلوص اور شدت احساس سے زیادہ اس کے فنی مشق و مہارت کی غمازی کرتی ہیں۔ مگر روزگار فقیر ایک با ضابطہ سوانحی خاکہ نہیں یہ متفرق ملاقاتوں کے تاثرات کی تخلیق ہے۔ ان تاثرات میں کسی نظم و ترتیب کا التزام نہیں کیا گیا ہے۔ انہیں صرف یاد کے رشتے میں پرو دیا گیا ہے۔ کچھ نقش مدھم پڑ گئے ہیں۔ یہ گذرے ہوئے لمحات کے ناتمام خاکے ہیں۔ کچھ تصویریں آب و رنگ کی آئینہ دار ہیں۔ یہ ماضی کی گہرائیوں میں گم ہونے سے رہ گئی ہیں۔ اور سطح شعور پر ایک زندہ تجربہ کی طرح برقرار ہیں۔ تجربات و واردات کے ایسے بیان میں جو خلوص اور سچائی ہوتی ہے سوچے سمجھے منصوبہ پر لکھے ہوئے سوانحی خاکے میں کم ہی نظر آتی ہے۔

گو یہ صحیح ہے کہ روزگار فقیر اپنی ہئیت کے اعتبار سے اردو کے دیگر تذکروں اور سوانحی کوششوں سے مختلف ہے یہاں واقعات کا انتخاب مقصدی نہیں معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مصنف نے بزرگ